© rasailojaraid.com

ادبیات

پروفیسر میاں انعام الرحمٰن

ثقافتی زوال کا رجائیہ نوحہ

''چلو جگنو پکڑتے ہیں'' کلیم احسان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں اس شعری روایت کی ''ترفع'' جھلکتی ہے، جو میر و ناصر کے ادوار سے گزر کر موسمِ گل کی حیرانگی میں رونما ہوئی اور خود اس مجموعے میں جا بجا بکھر گئی:

دل ہمارا اجاڑ بستی میں
ایک خالی مکان لگتا ہے

مریدِ میر، رفیقِ حزن کہتا جا رہا ہے:

مرا دیوان ہوتا جا رہا ہے
کہ غم آسان ہوتا جا رہا ہے

ہو سکتا ہے بعض اصحاب کو اس سے اتفاق نہ ہو کہ شعر و سخن کے دیپ، خونِ جگر سے جلتے ہیں اور خونِ جگر ''روحِ غم'' ہے۔ کم از کم راقم کی نظر میں تو پر مسرت لمحوں کی اچھل کود، ہوا کے اس جھونکے کی مانند ہے، جو آیا اور گزر گیا، جبکہ روحِ غم کی یہی ''روح'' ہے کہ شدت اور تیز بہاؤ کے باوجود بھی ''نقش گری'' سے محترز نہیں رہ سکتی۔ اگر یقین نہیں تو بہتے پانی کے اس نقش پر غور کیجیے جو وہ ''پتھر'' پر بھی ثبت کر دیتا ہے۔ روحِ غم اور بہتے پانی، دونوں کی فطرت میں نقش گری لکھی ہے (بہاؤ اور ٹھہراؤ کے باعث)۔

محبت روگ بنتی جا رہی ہے
مجھے سرطان ہوتا جا رہا ہے

یہاں تک تو اس مجموعے میں دبستانِ میر کا بکھراؤ ہے، اس سے آگے سبھاؤ شروع ہو جاتا ہے۔ کلیم کے پہلے شعری مجموعے ''موسمِ گل حیران کھڑا ہے'' میں بھی ایسی علامات جھلملا رہی تھیں، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی ترفع بہت سبھاؤ سے ہو گی، مثلاً:

مرے باہر خموشی چھا گئی ہے
مرے اندر کبوتر بولتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راقم نے اس شعر کے ضمن میں لکھا تھا کہ:

''کبوتر معصومیت اور جمال کا آئینہ دار ہے۔ کبوتر امن کا پرندہ ہے۔ کبوتر کا استعارہ، شاعر کے مزاج کی شائستگی اور انسان دوستی کا مظہر ہے۔لیکن کبوتر کا صرف اندر بولنا اور باہر خاموشی ، بہت معنی خیز ہے۔ بِرصغیر کی شعری روایت میں کبوتر قاصد کی علامت ہے۔ ہر اعتبار سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر امن کا پیغام رکھتا ہے،لیکن اس کا اظہار نہیں کر پا رہا۔امن کا جذبہ اس کے اندر پھڑ پھڑا رہا ہے،لیکن ہمارا شاعر بے بسی محسوس کرتا ہے۔معروضی واقعیت کی منفی صورتِ حال نے کلیم کی شعری فعلیت کو شعرِ عالیہ کی سطح پر اظہار کے اعتبار سے شدید متاثر کیا ہے ۔صوفیانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو شاعر،معرفت کے بعد لوگوں کی طرف واپسی کا سفر اختیار نہیں کر سکا (ایسا اکثر دیکھنے میں آیا ہے)۔محولہ بالا شعر، کتاب کے عنوان سے بھی مناسبت رکھتا ہے۔ حیرانی کی انتہا خاموشی کا سبب بنتی ہے اور موسمِ گل کو کبوتر سے قریبی نسبت ہے۔ یوں موسمِ گل اور کبوتر شاعر کی باطنی آواز کو ظاہر کرتے ہیں اور حیرانی وخاموشی ،معروضی جبر کو''۔

اب کلیم کے نئے مجموعہ کلام میں ''جگنو'' ایک ایسا استعارہ ہے، جو مذکورہ بے بسی کی ترفیع بن کر ابھرا ہے۔جگنو صرف روشنی نہیں، بلکہ قابلِ رسائی روشنی ہے، ایسی روشنی ہے جو مستعار نہیں لی گئی ۔اقبال نے بھی جگنو کی زبان سے کہلوایا تھا کہ:

اللہ کا سوشکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

(اقبال کے تصورِ خودی کے سیاق وسباق میں آتشِ بیگانہ سے احتراز سمجھ میں آتا ہے اور جگنو سے نسبت بھی)۔ کیونکہ آتشِ بیگانہ ''شخصی شعلگی'' کو ہوا نہیں دے سکتی،اسی لئے ہمارے شاعر نے بھی کہہ دیا ہے:

وہ مجھے راستہ دکھاتا ہے!
مری مٹھی میں ایک جگنو ہے

مٹھی میں جگنو وہ روشنی ہے جو اپنی ہے، ذاتی ہے۔اہم بات یہ ہے کہ جگنو ہتھیلی پر نہیں، کیونکہ ہتھیلی ''لینے'' کی علامت ہے اور مٹھی ''دینے'' کی۔اس سے انانیت کا تاثر بھی ابھرتا ہے،لیکن آپ جانتے ہیں کہ پیدائش کے بعد بچے کا ہاتھ ''مٹھی'' ہوتا ہے، جس میں جگنو جگمگ جگمگ کر رہا ہوتا ہے۔یوں کلیم کی انانیت،ایک بچے کی انانیت معلوم ہوتی ہے:

جو خوشبو کے سفر میں ساتھ مجھ کو لے کے نکلی تھی
وہ لڑکی ایک تتلی تھی میں اک چھوٹا سا بچہ تھا

یہاں خوشبو کا سفر ''پہلی محبت'' کا استعارہ بھی ہے، تتلی اور بچے نے اسے اجلا اجلا کر دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جگنو کے حوالے سے ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ اس لفظ کے ذکر سے ہی کھیت کھلیان، شجر، پگڈنڈی اور ہریالی وغیرہ کا منظر ذہن کے افق پر پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح جگنو ایک ایسی ثقافت کی علامت بن جاتا ہے جو خاکی اور دیہی ہے، جس میں ایک طرف شیشم کی ٹہنیوں سے گونجتی چہچہاہٹیں اور پیپل تلے بنے ہوئے ''چونتے'' ہیں، تو دوسری طرف البموں میں سنبھال سنبھال کر رکھی ہوئیں اپنے پیاروں کی دل گداز یادیں، اور ان پر مستزاد، ماں کی محبت!! راقم کی نظر میں کلیم کی شاعری، دراصل اسی ثقافت کی تباہی کا وہ ''نوحہ'' ہے، جس میں ماں کی محبت سے سرشار ایک بچہ ریں ریں کرتا ہے، روتا بسورتا ہے لیکن ماں سے یہی محبت ''جگنو'' بن کر اس بچے کو نہ تو مایوس ہونے دیتی ہے اور نہ ہی ایسے کتھارسس کا باعث بننے دیتی ہے، جس سے شخصی شعلگی مدھم پڑ جائے۔ (ماں! مذکورہ ثقافت کی بھی علامت ہے)۔ کلیم کا یہ شعر راقم کے نقطہ نظر کو مزید تقویت دیتا ہے:

تمہارا کھیل تھا نادان بچو!
مگر چڑیا کو دیکھو مر رہی ہے

ہاں! بے جگنو ثقافت میں چڑیا مر ہی جاتی ہے۔ یہاں اپنی یادداشت پر دستک دے کر اس لوک کہانی کو ذہن میں لایئے جو (ذرا سے اختلاف سے) تقریباً ہر سماج میں پائی جاتی ہے، جس میں جگنو، چڑیا کو گھر چھوڑنے جاتا ہے۔ جگنو درحقیقت کسی سماج کی ''داخلی روشنی'' کی علامت ہے اور چڑیا ان خارجی اداروں اور رویوں کی علامت ہے جن سے انسان، انسان بنتا ہے۔ ہمارا شاعر واضح طور پر آگاہ کر رہا ہے کہ ان رویوں کی اصل روح ختم ہوتی جا رہی ہے، خالی خولی ڈھانچے سے رہ گئے ہیں، ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑانے والی روشنی مفقود ہو گئی ہے، زندگی پر موت طاری ہو گئی ہے۔ جب جگنو نہ رہے تو چڑیا بے سمت ہو کر آخر کیسے گھر پہنچ سکتی ہے؟ علومِ حاضرہ کی خلعتوں میں ملبوس 'دانشور' شاید کلیم کا یہ نکتہ نہیں سمجھ سکتے۔

اسی شعر میں مضمر اہم نکتہ یہ ہے کہ چڑیا مری نہیں، مر ''رہی'' ہے اور گدھ منڈلانے شروع ہو گئے ہیں۔ یعنی ابھی کھیل ختم نہیں ہوا، ہم لوگ ثقافت کو ''بے جگنو'' کرنے کا کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں تا کہ چڑیا (گھر کا رستہ بھول کر) مر جائے اور کھیل ختم ہو جائے۔ یہاں ہمارا شاعر ہمیں دعوت دیتا ہے:

چلو جگنو پکڑتے ہیں

یہ دعوت سماج کو اس کی روح لوٹانے کی دعوت ہے، وہ ثقافت لوٹانے کی دعوت ہے جو ارضی ہے، خاکی ہے، دیہی ہے اور اپنی ہے۔ یوں سمجھیے کہ زندگی پر سے موت کو ہٹانے کی دعوت ہے۔ یہیں پر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ شخصی شعلگی، کلیم کے تصورِ خودی کو ''متعین صورت'' میں سامنے لاتی ہے۔ یہ صورت اول و آخر، مذکورہ ثقافت کی ہی صورت پذیری ہے اور بس۔ (گویا کہ کلیم دبستانِ میر سے انتہائی وابستگی کے باوجود ''اقبالی رجائیت'' سے متاثر ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بغیر نہیں رہ سکا)

اس مجموعے پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی نہ صرف مذکورہ ثقافت کی صورت پذیری کے عناصر جھلملانے لگتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس ثقافت کی تباہی وانحطاط کے مختلف شیڈز اور پہلو بھی، ترفیعی سبھاؤ میں بکھراؤ کا سماں پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً اسی غزل کے یہ شعر دیکھیے:

چلو باغوں کو چلتے ہیں
چلو جگنو پکڑتے ہیں
ستارے، پھول اور شبنم
ہمارا دکھ سمجھتے ہیں

یہ دونوں شعر بطور ''قطعہ'' بھی لیے جا سکتے ہیں۔ آخری مصرعے نے معنویت اجاگر کر کے امریکن شاعرہ Maya Angelou کی نظم Woman Work کی یاد تازہ کر دی ہے۔ مایا نے بھی خواتین کی روزمرہ کی بے کیف مصروفیت کا رونا رو کر عناصرِ فطرت کی آغوش میں پناہ لینے کی خواہش کی ہے۔ اس کے ہاں بھی بے کیف مصروفیت سے مراد، زندگی کی روح سے دوری ہے۔ ہمارا شاعر بھی اسی بے کیف مصروفیت سے شاکی ہے۔ اسے یہ دکھ ہے کہ:

یہاں پر جاگنا ہی جاگنا ہے
یہاں پر رات ہوتی ہی نہیں ہے

اسی قبیل کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے، جس میں میر کی لہجے کی چاشنی بھی موجود ہے:

اک لہو سا ہے آنکھوں میں ٹپکا ہوا
جیسے صدیوں سے جاگے ہوئے لوگ ہیں

مایا کی نظم میں اس Stanza نے بے کیفی کے مقابل کھلتی ہوئی، تبدیلی کی کلی کو کھلا دیا ہے:

Fall gently, snow flakes
Cover me with white
Cold icy kisses and
Let me rest tonight

(ترجمہ): اے برف کے گالو! دھیرے گرو
اور مجھ کو دبا ڈالو سفید
ٹھنڈے برفانی بوسوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے دو مجھے آرام امشب

معلوم ہوتا ہے کہ مایا آج کی رات آرام کرنے کی خاطر، اپنے آپ کو سفید ٹھنڈے برفانی بوسوں سے ڈھانپنا چاہتی ہے، وہ برف کی چادر اوڑھنا چاہتی ہے، لیکن برف زندگی کی علامت نہیں ہے اس لئے مایا آرام کرنے کی آڑ میں، درحقیقت موت کی آغوش میں جانا چاہتی ہے۔ مسلسل جاگنے کی پاداش میں، روزمرہ کی بے کیف بے روح زندگی سے اکتا کر۔ لیکن ہمارے شاعر نے بے کیفی کی انتہائی حدوں کو چھونے کے باوجود رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ کہتا ہے کہ ستارے، پھول اور شبنم ہمارا 'دکھ' سمجھتے ہیں۔ کلیم روح سے عاری رویوں میں زندگی کا لہو دوڑانے کے لئے، ان میں رچاؤ پیدا کرنے کے لئے، باغوں میں چلنے کی بات کرتا ہے، جگنو پکڑنے کی بات کرتا ہے یعنی زندگی کی روح کو Possess کرنے کی بات کرتا ہے۔ وہ برف کی چادر اوڑھنے کی بجائے روشنیوں میں نہانے کی بات کرتا ہے:

سورج کو میرے سر پہ کھڑا کر دیا گیا
یعنی مری سزا بھی اجالوں کے ساتھ تھی

اس مجموعے میں شامل ایک غزل لمبی ردیف کے باعث کافی دلچسپ ہوگئی ہے، اس میں طرفگی اس اعتبار سے آئی ہے کہ غزل کے فطری انج کے مطابق ہر شعر کا اپنا الگ سے معنی تو موجود ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ نظم کے مزاج کے مطابق ایک ہی خیال یا پھر ایک خیال کے مختلف پہلوؤں کی بافت و بنت بھی اس میں جھلک رہی ہے۔ اسے ''نظمیہ غزل'' کہا جاسکتا ہے، ملاحظہ کیجئے:

دل کی باتیں لکھ کر میں نے غیر مکمل چھوڑ رکھی ہیں
کتنی غزلیں لکھ کر میں نے غیر مکمل چھوڑ رکھی ہیں
کتنے ورق ہیں سادہ جن کو بالکل سادہ رکھ چھوڑا ہے
کچھ پرسطریں لکھ کر میں نے غیر مکمل چھوڑ رکھی ہیں
جی چاہا ہے آج پرانے کاغذ کھول کے بیٹھ رہوں
جن میں یادیں لکھ کر میں نے غیر مکمل چھوڑ رکھی ہیں
تم بھی جانو مجھ کو تمہاری دید کی کتنی حسرت ہے
اپنی آنکھیں لکھ کر میں نے غیر مکمل چھوڑ رکھی ہیں
جیسے لکھتے لکھتے کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہو !
پاگل سوچیں لکھ کر میں نے غیر مکمل چھوڑ رکھی ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس مجموعہ کلام میں پہلے شعری مجموعے کے بہت سے حوالے بھی، یادوں کی گھمبیرتا سے لے کر خوف کی پرچھائیوں تک، تکرار کی حد تک موجود ہیں۔ ہمارے شاعر کا فکری کینوس، اسلوبِ بیان، تراکیب اور استعارے، انسانی احوال وظروف سے پرے نہیں ہٹے، کہ اس کی فطرت خاکی ہے۔ اسی وجہ سے کہیں سالار بکتا دکھائی دیتا ہے، کہیں ضرورتوں کے اگے ہوئے جنگل سے پالا پڑتا ہے، خالی جیب کا ذکر ہوتا ہے، کہیں کاسہ وکشکول توڑنے کے لئے کسی صاحبِ توقیر کی کھوج نظر آتی ہے اور کہیں لفظوں کے زیاں پر، عامیانہ سخن طرازی پر طنز وتنقید کے تیر برستے دکھائی دیتے ہیں۔ بلاشبہ کلیم کے کلام میں ایسی گیرائی، گہرائی اور تنوع ہے کہ اس کا احاطہ چند صفحات میں کرنا ناممکن ہے۔ اس مجموعہ کلام کی مجموعی فضا کے پیشِ نظر یہ کہنا بھی مشکل نہیں کہ ہمارے شاعر کے اظہار کا بنیادی حوالہ 'ثقافتی زوال' کے ارد گرد گھومتا ہے، لیکن اس اظہار میں ناامیدی کا پہلو غالب نہیں آیا، بلکہ اس ثقافت کی بازیافت کا جگنو جگہ جگہ جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے! راقم اسے ثقافتی زوال کا رجائیہ نوحہ نہ کہے تو اور کیا کہے؟

> ''جبر کرنا اور کچلنا کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ ہمیشہ ان سے غلط نتائج لازمی طور پر سامنے آتے ہیں اور بنیاد پرستوں کے علاوہ امکانی بنیاد پرستوں کو بھی انتہا پسندی کے راستہ پر ڈال دیتے ہیں۔ امریکہ میں پروٹسٹنٹ بنیاد پرست سکوپس مقدمہ میں اپنی ذلت اور توہین کے بعد اور زیادہ رجعت پسند اور زیادہ انتہا پسند ہو گئے۔ سنی بنیاد پرستی کی بدترین شکل ناصر کے اسیری کیمپوں سے ابھری۔ اور شاہ کے ظلم وجبر نے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کر دی۔ بنیاد پرستی جنگ کا راستہ ہے۔ بنیاد پرستوں کو ہمیشہ اپنی ہستی فنا ہونے کا خوف رہتا ہے۔ یہودی بنیاد پرست، صہیونی ہوں یا انتہائی قدامت پرست، آج بھی ہٹلر کے مظالم کے خوف سے لرزتے ہیں۔ سیکولرازم کے عمل کو جارحیت کی شکل میں دیکھنے والوں کی روحوں میں جبر نے گہرے گھاؤ لگائے ہیں اور ان کے مذہبی خیالات کو غلط راستے پر ڈال کر انھیں غیر روادار اور پرتشدد بنا دیا ہے۔ بنیاد پرستوں کو سازش ہر طرف نظر آتی ہے اور کبھی کبھی تو وہ مجنونانہ غصے کی گرفت میں آ کر ہوش وحواس کھو دیتے ہیں۔'' (کیرن آرمسٹرانگ)

نوٹ: ''دینی مدارس میں سماجی علوم کی تدریس کی اہمیت'' کے عنوان پر ۲ جنوری ۲۰۰۵ کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں منعقدہ فکری نشست سے جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کے خطاب کا متن آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔ (ادارہ)

© rasailojaraid.com